شاہ مقبول احمد کے افسانے: ایک تجزیاتی مطالعہ''

فاطمہ خاتون
(ریسرچ اسکالر (اردو)
شعبۂ عربی، فارسی، اردو اور مطالعات اسلامی
بھاشا بھون، ویشو بھارتی یونیورسٹی، شانتی نکیتن- 731235

ملخص

شاہ مقبول احمد مغربی بنگال کی افسانہ نگاری کا اہم نام ہے۔ مغربی بنگال میں ترقی پسند افسانوں کے بنیادگزاروں میں ان کا مقام اہم ہیں۔ تاہم وہ ہمیشہ صوبائی تعصب کا شکار رہے۔ ان کی افسانہ نگاری پر محققین و ناقدین کا قلم خاموش رہا۔ انھوں نے بیشک افسانے کم لکھے مگر جو لکھا معیاری لکھا۔ ویسے بھی کسی کی ایک تخلیق بھی اس کے تخلیق کار کو ادبی دنیا میں اعلیٰ مقام کا مستحق بنا دیتا ہے۔ اس کی سب سے عمدہ مثال راجندر سنگھ بیدی ہے، جس کی ایک ناولٹ

''ایک چادر میلی سی'' نے انھیں ناول نگار کے صف میں لا کھڑا کیا۔شاہ مقبول احمد کا واحد افسانوی مجموعہ ''پانچ افسانے اور انشائیہ'' شائع ہو کر قاری کو متاثر کرنے میں کامیاب رہا ہے۔اب یہ ہم جیسے اسکالر کا ادبی فریضہ ہے کہ ان کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کر کے اس کے مصائب ومحاسن سے ادب کے قاری کو متعارف کرائے تا کہ ایک افسانہ نگار کو اس کا جائز حق مل سکے۔

☆☆☆☆☆

مغربی بنگال کی سرزمین اردو نثر کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرتی رہی ہے۔اردو ادب کا کوئی بھی قاری فورٹ ولیم کی ادبی خدمات کو فراموش نہیں کر سکتا۔اردو افسانہ کی ترقی میں بھی یہاں کے افسانہ نگاروں نے اپنا خون جگر صرف کیا۔ بنگال میں افسانہ نگاری کا سنہرا دور ۱۹۳۵ء کے ترقی پسند تحریک کے دور میں شروع ہوا۔اس سے قبل یہاں طبع زاد افسانے کم اور ترجمے زیادہ لکھے گئے۔ترقی پسند تحریک کے عہد میں بنگال میں افسانہ نگاروں کی لمبی کھیپ سامنے آئی جن میں کچھ افسانہ نگاروں کا نام آسمان کی بلندی پر چمکا اور کچھ گمنامی کے اندھیرے میں گم ہو گئے۔ یہ ستم ظریفی علاقائی سطح پر ادیبوں کو جھیلنی پڑتی ہیں، جس میں بنگال کا نام سرفہرست ہے۔مغربی بنگال سے تعلق رکھنے والے ادیبوں اور افسانہ نگاروں کی یہ بدنصیبی ہے کہ ہمارے معزز نقادین ومحققین ان پر تفصیلی بحث نہیں کرتے اور کبھی ان پر لکھنے کی باری آتی ہے تو کچھ چنندہ ادیبوں اور افسانہ نگاروں پر ہی نظر کرم کی جاتی ہے۔لیکن اب ادب کو پرکھنے کا نظریہ بدل رہا ہے۔مقامی سطح پر کئی نقاد اور محقق سامنے آرہے ہیں جو ان لوگوں پر کام کر رہے ہیں جن کا نام اس گمنامی میں کہیں ماند پڑ گیا تھا۔ایسے ادیبوں اور افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام شاہ مقبول احمد کا ہے، جنھوں نے اردو ادب کی خدمت میں اپنی زندگی کا بڑا حصہ صرف کر دیا مگر ان کی جو پذیرائی ہونی چاہیے تھی وہ نہ ہو سکی۔ شاہ مقبول احمد اچھے مدرس تھے ساتھ ہی انھوں نے اردو ادب کے کئی اصناف میں طبع آزمائی بھی کی جس میں تحقیق، تنقید، انشائیہ، افسانہ، طنز ومزاح اور شاعری وغیرہ شامل ہیں۔

شاہ مقبول احمد کے افسانے ترقی پسند عہد سے تعلق رکھتے ہیں جو حقیقی زندگی سے زیادہ قریب ہیں۔اگر یہ کہا جائے کہ بنگال میں ترقی پسند افسانہ کی بنیاد مقبول احمد نے ڈالی تو شاید بے جا نہ ہوگا۔عشرت بیتاب نے بھی انھیں بنگال کا پہلا ترقی پسند افسانہ نگار کہا ہے۔جس کا انکشاف عشرت بیتاب کے نام لکھے خط سے ہوتا ہے، اس میں شاہ مقبول احمد صاحب لکھتے ہیں کہ:

''کلکتہ واپس آیاتو آپ کا گرانقدرمقالہ پڑھا، بہت پسندآیا۔ یہ آپ نے بالکل صحیح تحریر کیا ہے کہ بنگال میں ترقی پسندافسانوں کی پہل شاید مجھ سے ہی ہوئی ہے۔ معاصر افسانہ نگاراس وقت رومان کی دنیا میں محوتماشا تھے۔ بہرحال صرف پانچ افسانے کسی افسانہ نگار کا وقیع سرمایہ تونہیں ہوسکتے۔کوشش کی تھی زمانے نے گوشۂتنقید وتاریخ میں جگہ دے دی''۱۔ طالب خیر: شاہ مقبول احمد

شاہ مقبول احمد کا رجحان مقالہ نگاری کی طرف زیادہ تھا یہی وجہ ہے کہ وہ افسانہ نگاری پر پوری طرح توجہ نہ دے سکیں مگرانھوں نے جتنا لکھاوہ معیاری ہیں اورانھیں بطورافسانہ نگار ایک الگ مقام عطا کرتے ہیں۔ان کے افسانوں کا واحد مجموعہ'' پانچ افسانے اورانشائیہ'' کے نام سے ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔ اس میں کل پانچ افسانے اورایک انشائیہ'' قوت فیصلہ'' شامل ہیں۔ اس مجموعے میں شامل تمام افسانے اکتوبر ۱۹۴۰ء سے اگست ۱۹۴۱ء کے درمیان لکھے گئے، یوں دیکھا جائے توانھوں نے ایک سال کی مدت میں پانچ افسانے لکھیں۔ یہ دورترقی پسندتحریک کے عروج کا دور تھاجب کئی افسانہ نگار پروپیگنڈہ پراترآئے تھے مگرشاہ مقبول احمد نے اپنے افسانے کو اشتہاری اور پروپیگنڈہ بننے نہیں دیا بلکہ اپنی ذاتی زندگی میں پیش آنے والے واقعات وحالات کوحقیقی روپ سے افسانے کے قالب میں ڈھال دیا۔ان کے افسانے مختلف جگہوں پر بکھرے ہوئے تھے، جسے کتابی صورت میں لانے کی مقبول صاحب نے کوششیں نہیں کی۔ لیکن ان کے شاگرد عزیز ایم، اے نصراورنواب خان روہوی نے ان افسانوں کودیکجا کیااوراسے کتابی شکل میں لانے کے کام کوآگے بڑھایاتب جاکر یہ شائع ہوئی۔

شاہ مقبول احمد کی نگارشات کا سلسلہ ۱۹۳۴ء سے شروع ہوااوراپنی عمر کے آخری پڑاؤ تک وہ مسلسل لکھتے رہے۔ یوں تو ان کے افسانوں کی تعداد زیادہ نہیں لیکن اس کی افادیت سے انکارنہیں کیا جاسکتا،شاہ مقبول احمد کی افسانہ نگاری اوران کے نظریے کے متعلق عبدالروٗف لکھتے ہیں کہ:

''موصوف کی نگارشات کا سلسلہ ۱۹۳۴ء سے شروع ہوجاتا ہے۔ اس دور میں انھوں نے انشائیے اورافسانے لکھے،اگرچہ ان کی تعداد آٹھ دس سے زائدنہیں۔ لیکن افادیت کے اعتبار سے وہ قابل قدرضرور ہیں کیوں کہ ان کی روشنی میں نئی

جہتیں متعین کی جاسکتی ہیں۔ بنیادی طور پر وہ افسانہ نویس نہیں تھے، لیکن اس صنف کے ارتقاء کے متعلق ایک آفاقی نظریہ رکھتے تھے''۲۔

افسانے کے متعلق شاہ صاحب کا نظریہ کافی اہم ہے وہ افسانے کے خام مواد کے لیے ادھر ادھر نہیں بھٹکتے بلکہ ان کے نزدیک زندگی میں پیش آنے والا ہر واقعہ افسانے کی بنیاد بن سکتا ہے۔ شاہ مقبول احمد صاحب فرماتے ہیں کہ:

''پوری کائنات ایک عظیم افسانہ ہے۔ زندگی واقعات وسانحات سے بھری پڑی ہے۔ بکھرے ہوئے اجزائے کائنات کسی بھی افسانہ کا خام مواد بن سکتے ہیں۔ اور کہیں سے بھی افسانہ شروع ہوسکتا ہے۔ پھر بھی تلاشِ موضوع افسانہ نگاروں کی ایک ایسی عجیب ادا معلوم ہوئی کہ اس پر میرا افسانہ ''موضوع'' شاید ایک طنز بلیغ بن گیا۳۔

مقبول صاحب کا یہ بیان نہایت اہم ہے۔ انھوں نے اپنے افسانہ ''موضوع'' کا ذکر کر کے تلاشِ موضوع کے لیے بھٹکنے والے افسانہ نگاروں کو آئینہ دیکھایا ہے۔ کیوں کہ ان کا یہ افسانہ ان کی حقیقی زندگی میں پیش آنے والے ایک معمولی واقع پر منحصر ہے۔ جس میں انھوں نے سردی کے موسم میں تیسرے درجے کے بھیڑ بھاڑ والے ڈبے میں سفر کرنے کو موضوع بنا کر ایک موثر افسانہ تخلیق کر دیا۔ اس طرح کا افسانہ تخلیق کرنے کے لیے کئی افسانہ نگار موضوع کی تلاش میں مختلف صحراؤں کی خاک چھانتے ہیں۔

شاہ مقبول احمد کے افسانوی مجموعے کا پہلا افسانہ ''تبدیلی'' ہے جو اکتوبر ۱۹۴۰ء میں تحریر کیا گیا تھا۔ یہ دور ایسا تھا جب زیادہ تر افسانہ نگار ترقی پسند تحریک سے اثر پذیر ہو رہے تھے۔ مقبول صاحب بھی منشی پریم چند سے حد درجہ متاثر تھے، جس سے ان کے ذہن میں تغیرات ہو رہے تھے۔ ان کا افسانہ ''تبدیلی'' انھیں حالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس افسانہ کے سلسلے میں مقبول صاحب ''ایک بات'' عنوان کے تحت فرماتے ہیں کہ:

''سب سے پہلے جن ذہنی تغیرات کا مجھ پر بدرجہ غایت اثر ہوا تھا اس کا اعلان میں نے اپنے پہلے افسانہ ''تبدیلی'' کے توسط سے کیا''۴۔

اس افسانہ میں گاؤں کا تعلیم یافتہ شخص شہر جاتا ہے اور پھر چھٹی میں جب گاؤں آتا ہے تو

گاؤں اور شہر کی زندگی کے فوائد اور نقصانات کا موازنہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ گاؤں کے لوگوں کے حالات کو دیکھتے ہوئے رفتہ رفتہ اس کے اندر تبدیلی آتی جاتی ہے۔ وہ ہر وقت گاؤں کے لوگوں کے حالات کو دیکھ کر فکر مند رہتا ہے اور پہلے جیسا ہنسنا بولنا، کھیلنا کودنا، دوستوں کی محفلوں میں قہقہے لگانا سب آہستہ آہستہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ افسانہ مقبول صاحب کی آپ بیتی معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ تعلیم اور نوکری کے سلسلے میں انھیں کلکتہ میں مقیم رہنا پڑا۔ ۱۹۴۷ء میں ان کی تقرری اسلامیہ کالج میں اردو کے لکچرار کی حیثیت سے ہوئی اس کے بعد کلکتہ یونیورسٹی میں جز وقتی لکچرر رہے۔ آخر میں مولانا آزاد کالج سے صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے یوں ان کا زیادہ وقت شہر کی بھیڑ بھاڑ میں گزرا اور جب بھی چھٹی ملتی وہ اپنے آبائی گاؤں ضلع مونگیر بہار چلے جاتے۔ گاؤں کی پرسکون اور دلفریب فضا ان پر خوشگوار اثر ڈالتی، مگر گاؤں کے لوگوں کے حالات انھیں اندر اندر گھلاتے رہتے، اور یہی حال اس افسانہ کے ہیرو کا ہے۔ اس افسانہ میں گاؤں کی منظر کشی کمال کی ہے۔ اس افسانہ میں جزئیات کا ذکر دیکھئے:

> ''ہوا کے تیز و تند جھونکوں کے سامنے اونچی اونچی دیواریں کھڑی کی گئی تھیں۔ روشن اور چمکدار دھوپ کے مقابل کھپریل اور تہ بہ تہ پھونس کے چھپر تیار کئے گئے تھے۔ جدھر آنکھیں اٹھاؤ منزلوں میں میدان خالی ہے۔ فضا کی اس بے پناہی کے لیے پہاڑوں اور ندیوں کے دامن کا سہارا لیا گیا تھا۔[۵]

اس افسانہ میں میاں بیوی کی پرخلوص محبت ہے تو وہی دوستوں کی فکرمندی بھی، انسانی رشتوں کے مختلف پہلوؤں کی جھلک اس افسانے میں دیکھائی دیتی ہے۔ اس کہانی کے ہیرو کی حالت زار کو اس کی اہلیہ سمجھنے سے قاصر ہے۔ تو دوست اور بزرگوار اس کی اس روش سے ناخوش اس نوجوان کے اس حالت کی اہم وجہ اس کی عصری حالات سے واقفیت اور اس کا مسلسل غور فکر کرنے کا رویہ تھا، یہ ناخوشگوار حالات ہمارے سماج کا اہم جز بن چکے ہیں جس کا ذکر کرتے ہوئے راوی کہتا ہے کہ:

> ''میں اپنے گرد و پیش کے ماحول کو کبھی سرسری طور سے نہیں دیکھتا، گھر والوں کی کھوکھلی سبکدوشی، تعلیم و تربیت سے محروم بچوں کی قدرتی آوارہ گردی، مالی مشکلات کی بنا پر عزیزوں میں ازدواجی تعلقات میں کشیدگی، بیماروں کے مناسب مگر گراں علاج کے سامنے جن جنات، آسیب سایہ کی تاویلیں اور اس

کے لیے دعا تعویذ اور جھاڑ پھونک میں پناہ کی جستجو، ان پڑھ بیویوں کی چیخ پکار اور بے صبری، نادار شوہروں کی کوفت اور دل کی گرفت گی، بڑے بوڑھوں کی نئے زمانے سے بیزاری، پیارے پیارے ننھے بچوں کی پیدائش پر حقیقی خوشی کا فقدان، یہ اور اس کے قسم کے دیگر حالات تھے۔ جو میرے سامنے مستقل غور وفکر کے موضوع بن کر پیش ہوتے تھے''۶۔

یہ سماج کی تلخ حقیقتیں ہیں جس سے کوئی حساس فرد متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور مقبول صاحب ایسے ہی حساس ذہن کے مالک تھے، جنھوں نے ان مسائل کا ذکر نہایت عام فہم زبان میں اپنے افسانہ ''تبدیلی'' میں پیش کیا ہے۔

شاہ مقبول احمد کے مجموعے کا دوسرے افسانہ ''دوسرا رخ'' بھی اکتوبر ۱۹۴۰ء کا لکھا ہے۔ اس افسانے کی ابتداء میں مقبول صاحب نے عرض کر دیا ہے کہ مقامات وافراد فرضی ہیں۔ چوں کہ ان کی کہانیاں ان کے ذاتی تجربے کی غماز ہے اور ان کا انداز پیش کش ایسا ہے کہ لوگ اس مقامات وافراد کو حقیقی مان لیتے ہیں اور ذکر کئے مقام سے جوڑ کر افسانے کو دیکھتے ہیں اس افسانہ میں خانقاہ سے منسلک لوگوں اور خانقاہوں میں سالانہ عرس وقوالیوں کے موقعے پر ہونے والے ہنگاموں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس افسانے سے متعلق مقبول صاحب ''ایک بات'' میں فرماتے ہیں کہ:

''مقدس اور واجب التعظیم خانقاہوں کی مسند رشد وہدایت کا معتقد قدیم ہونے کے باوجود کچھ ایسے مناظر بھی مشاہدے میں آئے جس کے ایک رخ کی روداد افسانہ ''دوسرا رخ'' کا عنوان بن گئی''۷۔

ان کے افسانہ میں ہمیں وہ تصویریں صاف طور پر مل جاتی ہیں جو ہماری روحانی اور عرفانی قدروں کی ترجمانی اور ہماری ثقافتی روایات کی علم بردار ہوتی ہیں۔ اگر چہ حقیقت یہ ہے کہ بڑھتے ہوئے سماجی اور معاشی خلفشار کے ملبوں میں یہ روایات کہیں دفن ہو چکی ہیں۔ افسانہ ''دوسرا رخ'' جہاں محفل سماع کا مکمل نقشہ پیش کرتا ہے تو وہی اس میں خانقاہوں میں مذہب کے نام پر جو لوگ اپنا مفاد حاصل کرتے ہیں ،اس پر طنز بھی کیا گیا ہے۔ خانقاہ میں جب لوگوں کو دستر خوان پر کھانے کے لیے بیٹھایا گیا تو کچھ لوگوں نے کس طرح خانقاہوں کی لوٹ کھسوٹ کو اجاگر کیا افسانے کے چند جملے ملاحظہ ہو:

''-غضب خدا کا لوٹ ہے ، اندھیر ہے، ہر سال ایک نہ ایک کمی ہی نظر آتی ہے

-سارے وقف کی آمدنی تو ہے مگر اپنے دوزخ کے بھرنے سے فرصت کہاں.....

-گزشتہ سال پھر بھی یہ بدنظمی نہ تھی کم از کم باقر خانی کے ٹکڑے تو نظر آتے تھے.....

-خدا کے یہاں یہ لوگ نہ جانے کن اعمال ناموں کے ساتھ جائیں گے.....

-جی جناب! گزشتہ سال اس میں (شربت میں) سے بھی پستہ کی سوائیاں غائب تھیں.....

-مگر خیر شربت تو تھا، دل کی آگ تو بجھ جاتی تھی۔ اس سال تو خاک پھانکنے کے سوا اور کیا ہے''۸۔

اس طرح کے جملے نہ صرف طنز کے طور پر استعمال کئے گئے ہیں بلکہ اس کے ذریعے مقبول صاحب معاشرے کی اصطلاح بھی کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا تعلق مذہبی خاندان سے تھا یہی وجہ ہے کہ انھوں نے خانقاہوں کا مشاہدہ نہایت قریب سے کیا تھا اور اس کے محاسن و مصائب سے وہ بہ خوبی واقف تھے جس کی تفصیل ہمیں اس افسانے میں مل جاتی ہے۔ جزئیات کی تفصیل بیان کرنے میں مقبول صاحب کو قدرت حاصل تھی۔ اس ضمن میں محفل سماع کا ایک منظر دیکھئے:

''کھانے پینے کا مرحلہ طے ہو چکا تھا، لوگ ادھر ادھر لوٹ پوٹ کر رہے تھے تا کہ مناسب قیلولہ ہو جائے، پھر تو رات بھر قوالی سننا ہے۔ بارہ دری میں تال سر کی آواز آئی، لوگ دھڑ پڑ کرتے ہوئے اٹھے اور کمرے میں مجلس سماع کے مطابق حلقہ باندھ کے دیوار سے لگ کر بیٹھ.....کچھ دیر تک تو ساز میں ساز ملائے جاتے رہیں۔ آخر موسیقی کے سحر نے کام کیا اور محفل جمنے لگی۔ نغمہ سرائی شروع ہوئی۔ پہلے پارسی کی دو چار معرفت کی چیزیں گائی گئیں۔ پھر نعت میں ''صلی علی محمد'' قسم کی وجد آفریں چیز شروع ہوئی۔ کیا کہنا ایک عجیب سماں بندھ گیا۔ اس پر ''اے وا'' کا ٹکرا جس کو کہنے والے کہیں گے روحِ نغمہ ہے۔ تاثرات کو قائم رکھنے کے لیے فوراً ہی بعد ایک پوربی چیز چھڑ گئی۔ ہائے اب کہاں ہوش و حواس، محفل غرق

تھی، بزم میں سناٹا تھا۔ سرور کائنات کی طرف اشارہ تھا، جب اہل بزم نے سنا ''گورے بدن پر چاندی چھنکے'' بس غضب ہی تو ہوگیا صبر وقرار رخصت ہوئے۔ بام ودر جھومنے لگے۔ چھتیں اڑنے لگیں، فرش کانپنے لگا، عالم رقص میں تھا، فضا پر وجد طاری ہوا۔ میرے پاس ایک صاحب تندرست وتوانا، شیروانی سرپر، دوپلی ٹوپی خلطہ دار غرارہ ملبوس متانت کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی طرف جو دیکھتا ہوں تو حالت متغیر ہے۔ چہرہ تمتماتا ہوا آنکھیں ڈبڈباتی ہوئیں ایک رقت طاری ہے۔ انھوں نے انگشت شہادت اٹھائی، ضبط نہ ہوسکا، قابو سے باہر ہوگئے۔ دونوں ہاتھ بڑی تیزی سے آسمان کی طرف اٹھائے۔[9]

محفل سماع کا منظر اس سحر انگیزی سے پیش کیا گیا ہے کہ قاری کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ بذات خود محفل سماع میں موجود ہیں۔

اس مجموعہ میں ان کا واحد انشائیہ ''قوت فیصلہ'' دسمبر ۱۹۴۰ء کی تخلیق کردہ ہے۔ مقبول صاحب خود اقرار کرتے تھے کہ انھیں رشید احمد صدیقی کا طرز پسند ہے اس لیے اس انشائیہ میں شاہ صاحب نے رشید احمد صدیقی کے طرز بیان اور انداز پیش کش کو اپنانے کی کوششیں کی ہے۔

افسانہ ''جوڑے کی تلاش'' فروری ۱۹۴۱ء کی تخلیق ہے۔ اس افسانہ میں گاؤں کی کھلی جگہ میں رہنے والے شخص کو کلکتہ جیسے بڑے شہر میں من پسند کرائے کے گھر کی قلت کے علاوہ کسی تنگ کمرے میں کئی لوگوں کے ساتھ رہنے سے جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ افسانہ بھی ان کی زندگی میں پیش آنے والے ایک تلخ واقع پر مبنی ہے جس کا اظہار کرتے ہوئے ''ایک بات'' کے تحت مقبول صاحب لکھتے ہیں کہ:

''بی اے کرنے کے بعد بیکر ہوسٹل سے ہوسٹل بدر ہوکر کلکتہ میں سکونت کے لیے کمرہ کی ضرورت ہوئی باوجود یہ کہ جناب ''To Let'' صاحب کے مکانات اس زمانے میں کلکتہ میں قدم قدم پر موجود تھے، مگر پھر بھی میری اوسط اور غیر معقول بضاعت مکان کی تلاش میں شریک داروں کی متلاشی ہوئی میں نے اپنے تلخ تجربات ''جوڑے کی تلاش'' کے زیر عنوان افسانہ میں اپنے عہد کے

قارئین تک پہنچادیے''[۱۰]۔

جس تلخ تجربات کا ذکر مقبول صاحب نے تحریر کیا ہے اس کی ایک مثال اس افسانے میں دیکھیے جب کمرہ نہ ملنے کی صورت میں کہانی کے راوی کو چار لوگوں کے ساتھ مشترکہ ایک چھوٹے کمرے میں رہنے پر مجبور ہونا پڑا تو اس کے ساتھ کیا دقتیں پیش آئی۔

> ''میرے برابر جو صاحب سوئے تھے انھوں نے نیند میں کروٹ جو لی تو پورا ایک پاؤں مجھ پر گد سے پڑ گیا، الٰہی خیر کہتا ہوا میں چونک پڑا، انھیں بھی ہوش آیا اور اوہو کہتے ہوئے ذرا ہٹ گئے اور سچ پوچھئے تو ہٹنے کے لیے جگہ بھی کہاں تھی، خیال آیا کہ یونیورسٹی جائے جہنم میں اور ایسے مر مر کے جینے سے باز...... جملہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ لیجئے اب کے ان صاحب کا ہاتھ میرے کلّہ پر پہنچا، یہ حضرت خاک بنگال تھے بنیائن تک اتار کر سوئے تھے ان کی بغل تھی اور میری ناک''[۱۱]۔

اس افسانے میں ایک زیریں لہر ہے کہ کس طرح کلکتہ جیسے بڑے شہر میں قلیل آمدنی والے لوگوں کے لیے مناسب کرائے کا کمرہ مل جانا کافی مشکل ہو گیا ہے، جس کی وجہ سے لوگ کسی اور کے ساتھ شریک دار بننے پر مجبور ہوتے ہیں۔ مگر وہ بھی اگر آپ کے مزاج کے برعکس ہوا تو حالات بد سے بدتر ہو جاتے ہیں۔

افسانہ ''موضوع'' مقبول صاحب کے مجموعہ کا چوتھا افسانہ ہے جو مئی ۱۹۴۱ء میں لکھا گیا۔ اس افسانے میں گاؤں کے ایک شخص کے شہر جانے کی تیاری کی خبر سن کر گاؤں کے مختلف لوگ شہر میں رہنے والے اپنے اپنے رشتے داروں کے لیے تحفے، خطوط اور کھانے پینے کی چیزیں دے کر دعاؤں کے ساتھ رخصت کرتے ہیں۔ سردی کے موسم میں تیسرے درجے کے بھیڑ بھاڑ والے ڈبے میں سفر کرنے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ زبان بالکل عام فہم اور سادہ ہے لیکن انداز پیش کش ایسا کہ تیسرے درجے کے ڈبے میں سفر کرنے والے مسافر کی حالت زار کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے، قاری کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ خود اپنی آنکھوں سے ان سارے مناظر کو دیکھ رہا ہے۔ سفر کی یہ تصویر کشی ملاحظہ ہو:

> ''گاڑی چھوٹ رہی ہے قلی ساتھ ساتھ دوڑ رہا ہے، بگڑ رہا ہے۔ ایک ہاتھ سے میں کیوں کر پیسے نکالوں اور دوں، آخر ایک شخص کی گود میں گھڑی پٹکی اور پیسے

حوالے کئے اب یہاں جنگ کا سامنا! میں نے مجبوری سمجھائی۔
مشکل سے سمجھ میں آئی، خیر مان گئے۔ جائے تنگ است مرد ماں بسیار کی وجہ سے
سردی تو سردی پیشانیاں عرق عرق ہورہی ہیں۔ اس طرح جامد وساکت کھڑا
ہوں جیسے کسی کو خول اندر کھڑا کردیا گیا ہو۔ مجال نہیں کہ ذرا بھی ہل سکوں جہاں
ہاتھ اٹھائے اور کسی کی چندیا سامنے آگئی۔ کھڑے کھڑے ذرا سہارا لینے کو
جھکا کہ میری کہنی سے کسی کی ناک لڑگئی۔ چوتھے اسٹیشن پر جنکشن آیا۔ مشکل سے
سامان اتارنے کے بعد دوسری گاڑی کا انتظار کرنے لگا''۱۲۔

معمولی واقعات کو کیسے کہانی کا موضوع بنانا ہے مقبول صاحب اس سے بخوبی واقف تھے اور اس کی زندہ مثال ان کے یہ افسانے ہیں۔

شاہ مقبول احمد کے افسانوی مجموعہ کا آخری اور پانچواں افسانہ ''زیور'' ہے۔ ان کے افسانوں میں یہ افسانہ کافی اہم ہے۔ جہاں اس میں ایک عورت کی مصیبت بھری زندگی کی روداد ہے تو وہی اس کا پرعزم حوصلہ بھی۔ افسانہ ''زیور'' اگست ۱۹۴۱ء کا تحریر کردہ ہے۔ اس افسانہ میں گاؤں کے غریب خاندان کی لڑکی نذیرن کی پریشانی اور مصیبت سے بھری زندگی کا ذکر ہوا ہے۔ نذیرن گاؤں میں تنہا رہتی ہے اس کی بہن دوسرے گاؤں میں بیاہی ہے جو اسے اپنے پاس رکھنا چاہتی ہے مگر نذیرن اتنی باحوصلہ اور خوددار ہے کہ وہ اپنی بہن کی مدد کو قبول نہیں کرتی اور اپنے بل بوتے پر زندگی گزارتی ہے۔ گاؤں کے لوگ اس سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ گاؤں کے ہر گھر میں اس کے لیے کوئی نہ کوئی کام نکل آتا ہے۔ اس کا اپاہج شوہر کلکتے میں رہتا ہے۔ نذیرن کی واحد دولت اس کا ایک زیور ہے جسے جب بھی وہ بندھک رکھتی ٹھیک اس کے آٹھ دس دنوں بعد اس کا شوہر گاؤں آجاتا۔ وہ شوہر پرست ہے اور برے سے برے حالات میں بھی اپنے شوہر کے خلاف نازیبا الفاظ پسند نہیں کرتی۔ اس کا مطلبی شوہر جب گاؤں آتا نذیرن کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہتا۔ لیکن نذیرن کا وہ اکلوتا زیور چوری ہوجاتا ہے جس سے اس کے گھر میں ماتم کا ماحول پسر جاتا ہے۔ یہ افسانہ بھی حقیقی زندگی سے ماخوذ ہے جس کی تخلیق کے سلسلے میں شاہ مقبول صاحب فرماتے ہیں:

''تعطیل میں مکان گیا تو ایک ایسی قابل رحم خاتون کے حالات سے آشنا ہوا جس
کے ناکارہ شوہر نے اس کے سہاگ کو رشک بیوگی بنادیا تھا۔ اس کے باوجود اس

کی والہانہ شوہر پرستی اور اس کے تنہا اثاثۂ حیات ایک زیور کے چوری ہوجانے کا حال معلوم ہوا تو میری نوک قلم سے ''زیور'' جیسا افسانہ اشک خونین بن کر صفحہ قرطاس پر بے اختیار ٹپک پڑا''۱۳۔

اس افسانہ میں نہ صرف ایک مظلوم عورت کا درد ہے بلکہ دیہاتی علاقوں میں شادی بیاہ کے موقع پر جو دھوم رہتی ہے اس کی بھی جھلک اس افسانے میں موجود ہے۔ بہار کے مگہئی علاقے کے رہن سہن اور مختلف کیفیات زندگی کو مقبول صاحب نے پُر اثر طریقے سے قلمبند کیا ہے۔ اس افسانہ کی زبان بالکل سادہ ہے، جس میں اسی بولی کا استعمال ہوا ہے۔ جیسا بہار کے مگہئی علاقوں میں بولی جاتی ہیں۔ افسانہ ''زیور'' کے متعلق ڈاکٹر شفیع الرحمٰن لکھتے ہیں کہ:

''یہ افسانہ لسانی اعتبار سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ ان میں بہار میں مگہئی علاقوں کے شرفاء وعام لوگوں کے گھروں میں بولی جانے والی زبان کو مقبول صاحب نے افسانہ کا جامہ پہنایا ہے۔ بالفظ اور محفوظ کر دیا ہے۔ صرف زبان ہی نہیں بلکہ زندگی کے مجموعے حادثات ، واقعات اور کیفیات کو پُر اثر انداز میں قلمبند کر دیا ہے تا کہ آنے والی نسلیں اس علاقۂ خاص کی لسانی وتہذیبی اور ثقافتی وراثت سے واقف ہوسکیں''۱۴۔

عورتوں کے جذبات کے اظہار میں یہ افسانہ مقبول صاحب کے تمام افسانوں میں افضل ہے۔ زیور چوری ہونے کے بعد نذیرن کی جو حالت ہوتی ہے ویسی حالت کسی کی سہاگ اجڑ جانے پر ہوسکتی ہے۔ افسانہ کا یہ اقتباس دیکھئے جس میں نذیرن کا درد صاف طور پر عیاں ہے۔

''دوپہر کا سناٹا تھا نذیرن کے گھر سے رونے کی آواز آئی ۔ پڑوس میں عورتیں گئیں، ہائے سر پیٹ رہی تھی زیور چور چلے گئے تھے ۔ بین کر کر کے زار وقطار روتی، کبھی دوہتر سر پر مار لیتی۔ کبھی خود کو زمین پر دے مارتی، لوٹتی پچھڑ جاتی، عورتیں سہارا دیتیں۔ سمجھاتیں، کوئی ترس کھا کے کہتی کہ ''ہائے غریب کے گھر کی جمنی بڑھی تھی۔ جڑاؤ گہنے بھی اس کے چاندی کے زیوروں کے سامنے گڑ تھے، بہن مثل ہے کہ اپنی دمڑی کے آگے دوسروں کی اشرفی بھی مات ہے''۔ بتول کی

اماں کہتیں بیچاری کیسے نہیں ترپے اس کی چہیتی بتول کے بیاہ کی
نشانی تھی۔ زیور رہ جاتے تو یادگار رہتی''.....نذریں روتی ہی چلی جاتی تھی''۱۵۔

شاہ مقبول احمد نے جس دور میں افسانے لکھے اس وقت کے افسانے طویل ہوا کرتے تھے جب کہ ان کے مقابلے مقبول صاحب کے افسانے مختصر ہیں، جس کی زبان عام فہم اور بالکل سلیس ہیں۔ ان افسانوں میں جہاں گاؤں کی سادگی اور سکون ہیں تو وہی کلکتہ شہر کا ہجوم، یہاں کی بھاگم بھاگ والی زندگی اور ان تمام حالات سے متاثر ہوتا ایک عام انسان۔ شاہ مقبول صاحب نے افسانے کم لکھے جس کے متعلق وہ خود کہتے ہیں کہ ''مقالہ نگاری کے شوق نے چندے قیام کے بعد اس کوچۂ (افسانہ نگاری) سے بھی مجھے آخری طور پر رخصت کر دیا''۔ بھلے ہی وہ قلیل مدت میں افسانہ نگاری کے میدان سے باہر نکل گئے مگر مغربی بنگال کے افسانہ نگاری کے سفر میں اپنا مقام متعین کر گئے۔ دنیا میں کئی فنکار ایسے ہیں جن کی اکلوتی تخلیق بھی انھیں ایک معیاری مقام عطا کر چکی ہے، جس کی ایک مثال ہم راجندر سنگھ بیدی کی دے سکتے ہیں، جو اپنے ایک ناولٹ ''ایک چادر میلی سی'' کے ذریعے ناول نگاری کی دنیا میں اپنے لیے ایک اہم مقام بنا گئے، پھر یہاں تو مقبول صاحب کے پانچ افسانے ہیں۔ مقبول صاحب کے افسانے اپنے دور کی منھ بولتی تصویریں پیش کرتے ہیں، جس میں اس دور کے سماجی، سیاسی حالات کے علاوہ شہر اور گاؤں کی زندگی کی تضاد کا برمحل اظہار ملتا ہے۔ شاہ مقبول صاحب کے افسانوں کے سلسلے میں ڈاکٹر عشرت بیتاب رقم طراز ہیں کہ:

> ''ایک فن کار اپنی اکلوتی تخلیق سے بھی پہچانا جا سکتا ہے۔ یہاں تو پانچ افسانے موجود ہیں، جو بنگال کے افسانوی ادب کے ارتقائی دور کی منہ بولتی تصویر معلوم پڑتے ہیں، جن میں اس دور کے ماحول کی، معاشرے کی، سماجی و سیاسی حالات کی، گاؤں کی، شہر کی اور انسان کی بے بسی کی، افراد کی (بے) راہ روی کی اور بنگال کی بھوکی پیڑھی کی تصویریں نمایاں نظر آتی ہیں''۱۶۔

شاہ مقبول صاحب کے افسانے موضوع اور زبان کے لحاظ سے کافی اہم ہیں، کئی ادیب اپنی علمیت کا اظہار کرنے کے لیے گنجلک اور مشکل الفاظ کا استعمال کر کے قاری کو متاثر کرنے کی کوششیں کرتے ہیں جب کہ مقبول صاحب عام زندگی کی باتیں عام الفاظ میں کرتے ہیں۔ کردار نگاری کی اگر ہم

بات کریں تو انھوں نے اردو ادب کو کوئی لافانی کردار تو نہیں دیا مگر ان کے افسانوں میں خیالی دنیا کے لوگ نہیں بلکہ ہندوستانی سماج کے عام لوگ ہیں جو مختلف رشتوں کو نبھاتے نظر آتے ہیں۔ جن میں بیوی، بیٹی، بھائی، بھابھی، دوست احباب نیز دیگر لوگ شامل ہیں، جن کے جذبات کا اظہار مقبول صاحب کے افسانوں میں بخوبی ملتا ہے۔ اگر وہ مسلسل افسانہ لکھتے رہتے تو شاید اردو ادب کو کئی لافانی کردار دے سکتے تھے۔ کیوں کہ ابتدائی دور کے افسانوں میں ہی ان کا فنی شعور نکھر ہوا تھا۔ ہوسکتا ہے وقت کے ساتھ اس میں اور جلا پیدا ہوتی۔ مقبول صاحب کے افسانوں میں شوخی وظرافت، نکھرا اسلوب، اشارے کنائے میں تلخ حقیقت کا اظہار اور اس میں معنی کا اتھاہ سمندر موجیں مارتا دیکھائی دیتا ہے۔ ان کا ہر افسانہ زندگی کی کسی نہ کسی حقیقی پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ شاہ مقبول احمد کے افسانوی مجموعہ ''پانچ افسانے اور انشائیہ'' کے متعلق سالک لکھنوی رم طراز ہیں کہ:

> ''معاشرے پر طنز کے لیے مکان کی تلاش ریل کے ڈبوں میں لاٹھیوں کا رقص، پیر صاحب اور ان کے جگمگاتی خانقاہ، عرس کی شان وشوکت، قوالی اور لوگوں کی بدحالی، بڑی زمیندار کی نشستوں کا رنگ، گاؤں والوں کی زبوں حالی، شہروں کی بھیڑ بھاڑ، شاہد وا حساس اور ان دونوں کے انضمان سے پیدا شدہ، سلیس جملے اس چھوٹی سی کتاب میں کیا کچھ نہیں ہے'' ۱۷۔

گرچہ مقبول صاحب کے افسانوں کا اثاثہ بہت مختصر ہے، لیکن جب بھی بنگال کے افسانوی ادب اور خصوصًا آزادی سے قبل افسانہ نگاروں کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس میں شاہ مقبول احمد کا نام ضرور لیا جائے گا۔

☆☆☆